بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ کسی شے، فرد، عقیدہ یا نصب العین سے وابستگی کا ایک ہی معیار ہے کہ انسان اُس کے لیے کتنا ایثار کر سکتا ہے اور اُس کے لیے کتنی قربانی دے سکتا ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اپنے خالق اور مالک کی بندگی، اُس کے رسول کی غلامی اور اس کے دین کی خدمت اور چاکری کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ سخت کٹھن اور دشوار منزل ہے۔ اس راہ میں انسان کو ہر طرح کے مصائب پیش آتے ہیں، اُسے ہر طرح کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور اُسے ہر طرح کے شدائد سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

(البقرہ - ۲۱۴)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے درآنحالیکہ (ابھی) تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی، اور انہیں ہلا ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ اُن کے ہمراہ ایمان لائے تھے پکار اُٹھے کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی۔ سُن رکھو اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔

مشہور مفسر امام فخر الدین رازی نے باساء اور ضراء میں جو لطیف فرق ہے اُسے بیان فرماتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے میں راحت اور آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرا درد و اذیت کو ظاہر کرتا ہے یعنی ایمان لانے کے بعد نہ صرف انسان کو اپنے آسائش و آرام سے محروم اور دستبردار ہونا پڑتا ہے

بلکہ اُسے اللہ کی راہ میں دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے مختلف مظاہر اور دائرے ہیں ۔ اس کا سب سے پہلا مظہر وہ قلبی کیفیت ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرنے والوں کو خدا وندِ عالم پر غیر متزلزل یقین اور ایمان ہونا چاہیے ۔ اگر اُسے باری تعالیٰ کے وجود، اس کی صفات اس کے ساتھ عہد و پیمان اور اس کے وعدوں پر یقین نہ ہوگا تو وہ محبت کے دعویٰ میں کبھی سچا اور مخلص نہیں مانا جا سکتا ۔ جس ذات کے ساتھ گہری وابستگی کے آپ دعویدار ہیں سب سے پہلے اس پر بھروسہ ضروری ہے ۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔	بیشک مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر (اس میں) کبھی شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یہی لوگ راست باز ہیں ۔ (الحجرات ۔ ۱۵)

ایمان کی پہلی منزل اپنے قلب و دماغ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کرنا ہے ۔ ریب و تشکیک ایمان کی ضد ہے ۔ جس دل میں شکوک کی جھاڑ جھنکاڑ موجود ہو اُس میں کبھی بھی ایمان کی فصل نہیں اُگ سکتی ۔ ایمان جو امن سے مشتق ہے اس کے اصل معنی ہی بقول امام راغب نفس کے مطمئن ہونے اور خوف کے دُور ہونے کے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس سے مراد وہ تصدیق ہے جس سے اطمینان حاصل ہو جائے اور کوئی تردّد باقی نہ رہے ۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہود کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (النساء ۔ ۵۱)	کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں ۔

یہاں یُوْمِنُوْنَ کا لفظ بطور طنز استعمال کیا گیا ہے اور اُن کے فہم و فراست کی مذمّت کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ ایسی بیکار چیزوں سے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی بھی باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتیں (امام راغب)

ایمان کامل یکسوئی، دل و دماغ کے مکمل اطمینان اور یقینِ محکم کا نام ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکا تو وہ حلاوتِ ایمانی سے محروم ہے۔ ایمان کے معنی ہی یہی ہیں کہ انسان تمام اطراف سے نفع کی امید اور نقصان کا خوف ہٹا کر صرف اللہ، اس کے رسول اور اُس کے دین کے ساتھ وابستگی پیدا کرے۔ اُس کے نزدیک اللہ کی رضا، اُس کے رسول کی محبت اور اُس کے دین سے تعلقِ خاطر دنیا کے ہر دوسرے تعلق، دنیا کے ہر دوسرے رشتے پر فوقیت رکھتا ہو، بلکہ دنیا کا ہر دوسرا تعلق اس ایک تعلق پر بادنیٰ تامّل قربان کیا جا سکتا ہو۔ اگر بھلائی کی تلاش ہو تو اُسے اللہ اور رسول کی محبّت اور اُن کی سچّی اطاعت گزاری اور اُس کے دین کی پیروی میں تلاش کیا جائے۔ اگر نقصان اور زیاں کا خوف لاحق ہو اور اس سے بچنے کی آرزو ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اُس کے خالق و مالک نے کن چیزوں کو ضرر رساں قرار دیا ہے اور اُن سے محفوظ رہنے کے لیے کیا تدابیر بتائی ہیں۔ اگر انسانوں کے ساتھ روابط قائم کرنا مقصود ہو تو اس معاملے میں بھی اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کو ہی پیشِ نظر رکھا جاتے۔ الغرض ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی پُوری توجہ اور اُس کی ساری فکری اور جسمانی صلاحیتیں قطب نما سوئی کی طرح صرف ایک رُخ پر لگی رہیں۔ ہم روزمرّہ زندگی میں جو لفظ اعتقاد بولتے ہیں تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ساری اطراف کو جمع کر کے گرہ باندھ دی جائے۔ یعنی انسانی فکر و عمل کے سارے گوشے اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اطاعت کے مرکز پر سمٹ کر رہ جائیں اور حیاتِ انسانی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ اس ایک مرکز سے مستنیر ہو۔ انسان کو اپنے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے اسی ایک مرکز سے سامان فراہم ہو، اسے اپنی معاشی فلاح، اُخروی نجات، معاشرتی عدل و انصاف، سیاسی استحکام اور اسی نوعیت کے دوسرے معاملات میں اسی سرچشمۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل ہو اور اُس کے اندر کسی دوسری سمت نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی خواہش تک پیدا

نہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے :

ذاق طعمَ الایمانِ مَنْ رضی باللہ ربًّا و بالاسلامِ دینًا و بمحمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم رسولاً ۔ (مسلم)	اُس شخص نے فی الحقیقت ایمان کا مزہ چکھا جو خدا کی خدائی پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دل و جان سے مطمئن ہوگیا ۔

اللہ تعالیٰ، اس کے رسُول اور اُس کے دین سے محبت میں یکسوئی، ایک مثبت اور ایجابی کیفیت کا نام ہے جو منفی اور سلبی رجحانات کی نفی کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہے ۔ جس طرح معبودِ حقیقی کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرنے کے لیے معبودانِ باطل کا ابطال ضروری ہے بالکل اسی طرح اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان ایمان کے تقاضوں کے مقابلے میں باقی سارے مفادات یکسر نظر انداز کر دے ۔ ایمان اور عقیدہ خدا کے ساتھ کوئی نیم دلانہ اور عارضی وابستگی نہیں بلکہ یہ ایک نہایت مضبوط، گہرے، پائیدار اور ہمہ گیر تعلق کا نام ہے، جس کی چوکھٹ پر باقی سارے تعلقات کو قربان کیا جا سکتا ہے ۔ انسان جب تک اپنے قلب و دماغ سے جھوٹے خداؤں کی محبت پوری طرح محو نہ کر لے، اس وقت تک خدائے واحد پر ایمان کی شمع نہیں جلائی جا سکتی ۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے :

اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (توبہ ۔ ۲۴)	اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے ۔

اِس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے مال وجان، برادری، اولاد، صنعت و تجارت، آرام و آسائش کو راہِ خدا پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور دنیا کا کوئی عزیز رشتہ اور قیمتی سے قیمتی متاع اُس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ - (صحیح مسلم - کتاب الایمان)

کوئی تم میں سے مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت اولاد، ماں باپ اور سب لوگوں کی محبت پر غالب نہ آجائے۔

ایک دوسرے مقام پر تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں فرمایا:

من کان اللّٰہ ورسوله احبّ الیه مما سواهما -

یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

ان آیات اور احادیثِ نبوی کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک مومن کا سینہ عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول سے کس طرح معمور ہوتا ہے۔ اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے اور ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِّ الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کو نصیب ہوتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ - (البقرہ - ۱۶۵)

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے حالانکہ اہلِ ایمان تو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

ایمان کے بعد اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دُوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے اُن کو پکار کر سنا دیا گیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دینِ اسلام سے

مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ (مائدہ - ۵۴)

پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کریگا جنہیں وہ محبوب رکھے گا اور وہ اس کو محبوب رکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کوئی بے حس کیفیت نہیں جس سے انسان کے قلب و دماغ میں کوئی تلاطم نہ پیدا ہوتا ہو۔ محبت ایک نہایت ہی حساس اور انقلاب انگیز کیفیت ہے جو ایک طرف انسانی جذبات کی انتھاہ گہرائیوں کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے اور دوسری طرف اُس کے فکر و عمل میں غیر معمولی نمایاں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ وہ محبت جو قلب میں سوز، اللہ کی راہ میں اطاعت اور جاں نثاری کا جذبۂ صادق، احکامِ الٰہی کی پابندی کے لیے جوش اور ولولہ اللہ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا حوصلہ اور اس جدوجہد میں مصائب اور تکلیفات اٹھانے کا عزم پیدا نہیں کرتی وہ محبت نہیں بلکہ بے مروتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ الٰہی کی شمع روشن ہو مگر وہ ایمان کی حرارت اور سوزِ یقین سے خالی رہے اور اُس کی زندگی کے سارے گوشے اس نورِ ایمانی سے تابندہ اور درخشاں نہ ہونے پائیں۔ اللہ سے محبت کرنے والے کی دلی کیفیات کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ (المائدہ - ۸۳-۸۴)

جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے، اور وہ کہتے ہیں، کہ کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ مان لیں۔

یہ آیات حق اپند اور حق پرست لوگوں کی دلی کیفیات کی پوری طرح ترجمان ہیں۔ اللہ سے محبت کرنے والے اُس کے پیغام کو بے توجہی سے نہیں سنتے بلکہ اُسے ارشادِ ربانی سمجھتے ہوئے اس کی پوری عظمت کو قلب و دماغ میں رکھتے ہوئے قبول کرتے ہیں۔ پھر یہ پیغام اُن کے دل کے کسی گوشے میں ایک بھولی بسری داستان کی حیثیت سے نہیں پڑا رہتا بلکہ وہ انہیں شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس سے اُن کے دل کی دنیا زیر و زبر ہوتی ہے۔ ان کے اندر اپنے مرتبہ و مقام کو جاننے، اپنے خالق و مالک کو پہچاننے اور اپنے نامۂ اعمال پر غور کرنے کی زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ حق کا اُس گرمجوشی اور محبت سے استقبال کرتے ہیں جس طرح ایک ماں اپنے گم شدہ بچے کی مدتِ دراز تک جدائی برداشت کرنے کے بعد خیر مقدم کرتی ہے۔ ایک مومن و مسلم احکامِ الٰہی کو بار سمجھ کر قبول نہیں کرتا بلکہ بڑی خوشدلی اور گرمجوشی کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے۔ اُن کے بجالانے میں اُسے بڑی راحت ملتی ہے اور وہ اسے اپنی غیر معمولی سعادت خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی محبت کا ایک ہی معیار ٹھیرایا ہے کہ اس کے رسول کی پیروی کی جائے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۱)	اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو محبوب رکھے گا۔

محبتِ الٰہی کے دعووں کی جانچ کے لیے کتنا اچھا معیار بنا دیا۔ یعنی اتباعِ رسول۔ جو جتنا زیادہ متبعِ رسول ہوگا اُسی قدر اُس کی محبتِ الٰہی مسلّم و معتبر ہوگی۔

پھر اس کے ساتھ باری تعالیٰ نے اِس حقیقت کی بھی وضاحت فرما دی ہے کہ رسول کی اطاعت خوشدلی اور محبت کے ساتھ ہو اور اُس کے احکام کی بجا آوری میں انسان کو طمانیتِ قلب حاصل ہو اور یہ کسی طرح بھی اس کے لیے بارِ خاطر نہ ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	آپ کے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کُن نہ مان لیں۔ پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر

يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔   (النساء۔ ۶۵)   اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ خوشدلی سے تسلیم کریں۔

آیت نے اس حقیقت کو صاف کر دیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں محض رجوع ایمان کے لیے کافی نہیں ہے۔ عقلی اور اعتقادی حیثیت سے بھی اطمینان رسولؐ خدا کے فیصلوں پر ہونا چاہیے۔ حضورؐ کے ہر فیصلے کو پوری خوشدلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

سورۃ الحجرات میں باری تعالیٰ بارگاہِ رسالت کے آداب بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ   مسلمانو! تم اپنی آوازیں رسولِ خدا کی آواز سے اونچی نہ کرو۔

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر حضورؐ کی آواز سے زیادہ اونچی آواز نکالنا اعمال کے ضائع ہونے کا باعث بن سکتا ہے تو کیا حضور کی آرا، حضور کے فہم و فراست، حضور کے ذوق پر اپنی رائے، اپنے فہم اور اپنے ذوق کو مقدم رکھنا اعمال کو ضائع نہیں کر سکتا۔ جو شخص ایمان کا دعویدار ہے اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت کا دم بھرتا ہے اُس کے دعوے کی صداقت کا سارا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ وہ احکامِ الٰہی اور احکامِ رسول کی سچے دل کے ساتھ پیروی کرے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ   (الاحزاب۔ ۳۶)   اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم دیں تو پھر اُن کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے زندگی کے جن معاملات کے متعلق اپنے احکام صادر فرما دیئے ہیں اُن میں اہلِ ایمان کوئی من مانی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ان سب معاملات میں انہیں احکامِ الٰہی اور ارشاداتِ رسول کی پیروی کرنی چاہیے اور یہی طرزِ عمل اختیار کرنے سے وہ مومن و

مسلم کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو گا یا کوئی قوم ایسی ہو گی جس نے اسلام کے کسی اصول کو نہ اپنایا ہو یا جس کی زندگی کے تمام گوشے اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی ہوں۔ تعلیماتِ ربانی اتنی فطری اتنی ہمہ گیر اور اتنی حیات آفریں ہیں کہ ان کے اکثر و بیشتر حصوں کو اپنائے بغیر کسی صحت مند انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ افراد یا قومیں جو نہ صرف اسلام کی دشمن ہیں بلکہ سرے سے مذہب ہی کی مخالف ہیں اور اسے مٹانا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتی ہیں وہ بھی اسلام کے بہت سے اصولوں کو اپنانے پر مجبور رہیں۔ معلوم ہوا کفر بھی اپنی بقا، توسیع و ترقی کے لیے اسلام کے بعض اصول و ضوابط کا محتاج ہے۔ اس وقت روس سے زیادہ مذہبی بیزاری پر کس ملک کو ناز ہے لیکن وہاں بھی دیکھیے کہ ماں کی عزت و آبرو کی حفاظت، بہن کی عفت کا تحفظ، ماں باپ کا احترام، پڑوسی کے حقوق کا خیال، غریبوں اور بیکسوں کی معاونت و دستگیری، سماج کے کمزور طبقوں کو سہارا دینے کی آرزو، یہ سب وہ احساسات و جذبات ہیں جن کا سرچشمہ مادیت نہیں بلکہ مذہب ہے۔ ماں باپ اگر ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ قومی آمدنی میں اضافہ کی بجائے اس پر بار ہیں تو خالص مادی نقطہ نظر سے وہ وطن اور قوم کے دشمن ہیں۔ وہ کسی رعایت اور ہمدردی کے مستحق نہیں۔ انہیں جلدی جلدی ختم کر کے ان کے خون، ہڈیوں اور گوشت کو کام میں لایا جائے اتنا ہی معاشی اعتبار سے مفید اور کارآمد ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی قوم بھی یہ خالص معاشی تصورِ حیات اپنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ انسان کے اندر کچھ لطیف احساسات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں وہ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان مقدس احساسات سے ہی اُس کی انسانیت کا بھرم قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے باغی افراد اور مذہب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم رکھنے والی قومیں آج تک مذہب سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ مذہب اور اُس کی تعلیمات اُس کے تحت الشعور اور لاشعور میں ضرور موجود ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام انسان کی فطرت میں داخل ہے تو پھر ایک

مومن اور کافر میں یا ایک مسلم اور غیر مسلم قوم کے درمیان کیونکر تفریق کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم فرد یا مسلم قوم اللہ کے دین کو پورے اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ اپنانے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ دین ہی اس کی زندگی کا مدار اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہوتا ہے اس دین سے ہٹ کر یا اس کے کسی پہلو کو نظر انداز کر کے وہ کسی دنیوی اور اخروی بھلائی کا تصور نہیں کر سکتی۔ اسی دین کی پیروی کو وہ اپنی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس قوم کے افراد کو ذہنی سکون، قلبی اطمینان اسی دین میں میسر آتا ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل اسی دین میں تلاش کرتی ہے۔ الغرض انفرادی زندگی کی معمولی سے معمولی الجھنوں سے لیکر اجتماعی زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات تک میں دین ہی اس قوم کا اور اس کے ہر فرد کا رہنما ہوتا ہے۔ دین اس قوم کے قلب و دماغ میں، اس کے فہم و احساس میں، اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ فرد یا قوم اسی دین کی خاطر جیتی ہے اور اسی کی سربلندی کے لیے مرتی ہے۔ اسی حقیقت کو باری تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (الانعام ۔ ۱۶۳)

آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔

باری تعالیٰ کے ساتھ اس اطاعت شعاری کے مسلک کو چھوڑ کر جو لوگ اسلام کے بعض اصولوں اور ضابطوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اُن کے طرزِ عمل کو کسی اعتبار سے بھی مخلصانہ اور خدا پرستانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کی اصل غایت خدا کی رضا اور مالک الملک کی خوشنودی اور اس کے فیصلوں پر تسلیم و رضا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سامنے کچھ دوسرے مقاصد اور دوسرے عزائم رکھتے ہیں۔ البتہ ان مقاصد اور عزائم کی تکمیل میں اگر کچھ دینی اصول اور ضابطے مفید اور کارآمد ہوں تو وہ ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ دین کو اپنانا یا احکام الٰہی کی پابندی کرنا یا ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو خوشدلی اور ذوق و شوق سے، قصداً و ارادے کے ساتھ اختیار کرنا اُن کے پیشِ نظر

نہیں ہوتا۔ جس طرح مسافرت میں ہم بسا اوقات اُن راستوں پر بھی گزرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ہماری منزلِ مقصود کو نہیں بلکہ دوسری منزلوں کی طرف جاتے ہیں بالکل اسی طرح زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کی گزرگاہوں سے گزرتے ہوئے ہمارے قدم چند لمحوں کے لیے ایسے راستوں پر پڑ جاتے ہیں جو ہمیں اپنے نصب العین کی طرف لے جانے والے نہیں بلکہ دوسری سمتوں کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا کسی نصب العین کے حصول کے لیے بیتاب ہوگا اسی نسبت سے وہ زندگی کے ان چوراہوں سے زیادہ محتاط اور چوکس ہو کر گزرے گا کیونکہ یہی وہ اہم اور نازک مقامات ہیں جو اُسے تھوڑی سی بے احتیاطی اور غفلت کی وجہ سے غلط راستے پر ڈال کر اصل منزل سے بہت دُور لے جا سکتے ہیں۔ کسی نصب العین کے عشق میں سرشار افراد اور قومیں ایک لمحہ بھی کسی غلط راہ پر چلنا گوارا نہیں کرتیں۔

کسی نصب العین کے اثرات کسی فرد یا قوم میں اُسی وقت نمایاں ہوتے ہیں جب وہ اُسے پُوری یکسوئی کے ساتھ اپنائے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ نصب العین کے ساتھ پوری طرح وابستگی پیدا نہیں کرتا تو وہ اُس کے ثمرات سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس قوم کے رہنما اور اس کے افراد اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام اُن کا منتہائے مقصود ہے لیکن ان لوگوں کے سوچنے کے انداز، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے، ان کا تصورِ فلاح، ان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی افکار اور ان کی عملی سرگرمیوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے کہ انہوں نے قصد اور ارادہ کے ساتھ دوسرے راستوں کو چھوڑ کر اسلام کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس قوم کے اربابِ اختیار اور اہلِ علم کی باتیں سننے سے یُوں محسُوس ہوتا ہے کہ اسلام ان کے نزدیک ایک دلکش نعرے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس سے وہ بوقتِ ضرورت عوام کے جذبات بھڑکا سکتے ہیں۔

اسلام سے وابستگی کا سب سے پہلا ثبوت یہ ہے کہ امتِ مُسلمہ کو اس کے عوام اور خواص کو، اس کے

اہلِ علم اور اہلِ دانش کو، اس کے سیاست دانوں اور ماہرینِ معیشت کو، اور اس کے اربابِ اقتدار کو اس دین پر پورا پورا اعتماد ہو اور وہ اپنے دل میں اس امر کا یقین رکھتے ہوں کہ اُن کی اور اُن کی قوم کی بہتری کا راز صرف اس دینِ حق کو اپنانے میں مضمر ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اسلام پر اعتماد کی جگہ اس کے متعلق بے یقینی، اس کے مستقبل کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک اسکی تعلیمات کے متعلق کئی قسم کے شبہات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملت کے اربابِ اختیار اسلام کے ساتھ کچھ دوسرے افکار و نظریات، فلاح و بہبود کے کچھ دوسرے تصورات اور باطل نظامہائے حیات کے کچھ مادہ پرستانہ اصول لے کر دنیا کے سامنے بطور نصب العین پیش کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے تو ہمیں یہ خوشخبری دی ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یعنی دین ہمارے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا ہے اور باری تعالیٰ کو احکام کی صورت میں اور ضابطۂ حیات کی شکل میں ہمیں جو ہدایات دینی تھی وہ ہمیں نبی آخر الزمان کی وساطت سے مل چکی ہیں۔ اب اس میں کسی ترمیم و اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن ہم اسلام میں سوشلزم کے پیوند لگا کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ دین ناقص اور نامکمل ہے اور اس کی تکمیل غیر اسلامی عناصر شامل کرنے سے ہو سکتی ہے۔

باری تعالیٰ نے تو ہمیں واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ یعنی اس کی نظر میں بجز اسلام کے کوئی دوسرا ضابطۂ حیات، کوئی دوسرا نظریۂ زندگی، کوئی دوسرا اسلوبِ زیست، انفرادی اصلاح یا اجتماعی نظم کا کوئی دوسرا لائحہ عمل مقبول نہیں۔ لیکن ہم زبان و عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ تنہا اسلام ہمیں منظور نہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں کچھ دوسرے ضابطے، کچھ دوسرے اصول بھی درکار ہیں جن کی مدد سے ہم فلاح و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان اور غیر متزلزل اعتماد دونوں لازم و ملزوم ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اعتماد ایمان کی خشتِ اوّل ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ جب ہم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان کی اساس ہی سے محروم ہیں تو ہمارے

اندر دینِ حق کو اپنانے اور اُسے دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا جذبۂ صادق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کے بارے میں اس عدمِ اعتماد اور بے یقینی نے ہمیں زندہ اور انقلاب انگیز قوم بننے کے بجائے محض راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے جسے باطل کے جھکڑ جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔ چٹانیں اس وقت تک مربوط و مضبوط رہتی ہیں جب تک اُن کے عناصرِ ترکیبی کے درمیان ہم آہنگی اور پیوستگی موجود ہو۔ مگر جب اُن کے اجزا خارج سے مختلف اثرات قبول کرنا شروع کر دیں تو پھر نہ صرف ان کا باہمی ربط غائب ہو جاتا ہے بلکہ ان میں بڑی بڑی دراڑیں اور مہیب شگاف پڑ جاتے ہیں اور یہ چٹانیں بعد میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔

امتِ مسلمہ کے اندر آج جو ہمہ گیر فساد اور انتشار پایا جاتا ہے اور جسے اتحاد، تنظیم اور اخوت کے فلک شگاف نعرے اور اتفاق کی برکتوں کے بڑے دلچسپ وعظ بھی دُور نہیں کر سکے اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ ہم نے اسلام کو دل کی گہرائیوں سے قبول نہیں کیا۔ تصدیق بالقلب بلاشبہ غیر مرئی کیفیت ہے لیکن یہ کوئی ایسی غیر محسوس واردات نہیں جس کے اثرات انسانی زندگی کے کسی پہلو میں بھی نمایاں نہ ہونے پائیں۔ یہ ایک مقناطیسی کشش ہے جو سب سے پہلے انسان کے احساسات و جذبات، اُس کے افکار و نظریات کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرتی ہے۔ پھر ایک ہی طرزِ فکر کے حاملین کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑے مضبوط اور پائیدار رشتوں میں جوڑتی ہے۔ اُن کے اندر تنظیم اور اتحاد پیدا کرتی ہے اور اس کے بعد اُن کی صلاحیتوں کو ایک خاص مقصد کے حصول کی راہ میں لگاتی ہے۔

آج ہمیں مختلف اطراف سے اسلام کے بارے میں عجیب و غریب نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ کہیں اسلامی سوشلزم کی آواز بلند ہوتی ہے، کہیں اسلامی آمریت کے تذکرے ہو رہے ہیں۔ کہیں اسلام کو جدید بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ الغرض اسلام اِس دور میں عملِ جراحی کی نازک منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اگر یہ صورتِ حال کچھ مدت تک قائم رہی تو اس دینِ کا اس بُری طرح سے حُلیہ بگڑ جائے گا کہ ایک عام آدمی کے لیے دینِ حق کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لے کر اُٹھے ہیں اور

اسی میں ملتِ اسلامیہ کی نجات دیکھتے ہیں، وہ فہم و فراست کے دعووں کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دو اَن میل نظاموں کے درمیان کس طرح جوڑ قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ حضرات اپنے اس دعوے میں مخلص ہیں تو پھر ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسا فریب جس کا شکار معمولی عقل و فہم کا مالک بھی نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے سے ان لوگوں کی اسلام اور سوشلزم دونوں کے بارے میں جہالت اور ناواقفیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ حضرات فی الحقیقت جان بوجھ کر یہ کہہ رہے ہیں تو پھر یہ پوری امت بلکہ پوری انسانیت کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ "اجتماعی عدل" کی جس ترکیب سے یہ قوم کو اُلّو بنانے کا عزم رکھتے ہیں وہ بالکل ایک اضافی تصور ہے جس کے معنی اسلام اور سوشلزم میں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان اساسی فرق ہے اور ان کے مابین کوئی چیز بھی قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ان دونوں نظاموں کی بنیادی اقدار ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ ہیں۔ اسلام کا سارا نظام خشتِ اوّل سے لے کر کنگرے تک خدا پرستی کی بنیاد پر قائم ہے۔ خدا پرستی کا یہ تصور دینِ حق میں اس طرح محض رسم اور تکلف کے طور پر موجود نہیں جس طرح کہ کسی ثقافتی شو یا کسی سینما ہال کے افتتاح کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں خدا پرستی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا پورا نظام مادی اقدار کے بجائے اُن اخلاقی اقدار پر قائم ہے جو ہمیں باری تعالیٰ سے اُس کے رسول کی وساطت سے ملی ہیں۔ اشتراکیت میں الحاد کی طرح فیصلہ کن چیز اُس کی معاشی اور مادی افادیت ہے اس کے برعکس اسلام میں آخری حتمی اور قطعی معیار خدا کی رضا اور اُس کی ناراضگی ہے۔ اسلام میں سارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اخلاقی بنیادوں پر حل کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اشتمالیت اور اشتراکیت میں سارے معاملات کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے طے کیا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی نفع و نقصان کا جو میزانیہ بنتا ہے وہ اخلاقی قدروں اور اخلاقی فلاح و بہبود کے مطابق بنتا ہے اور اشتراکیت یا کسی دوسرے لادینی نظام میں اس میزانیہ میں اصل اہمیت مادی سود و زیاں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان

اس واضح اور بیّن فرق کو ہم یُوں تو زندگی کے ہر قدم پر محسوس کرتے ہیں لیکن مَیں یہاں چند باتیں بطور مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن مجید نے تعدّدِ ازواج کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے کیونکہ وہ حکیم ذات جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ اس کے مزاج اور اس کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی ضروریات سے پُوری طرح واقف ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں ایک انسان کی حقیقی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ آج نفسیات اور حیاتیات میں جو مختلف تحقیقات ہوئی ہیں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ تعدّد ازواج کی ضرورت بالکل مسلّم اور درست ہے۔ یہاں تک کہ WILL DURRANT وِل ڈیُوران جیسا متعصب اہلِ علم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جن قوموں نے اپنے ہاں فحاشی کو نیست و نابود کرنا چاہا انہیں تعدّد ازواج کو رواج دینا پڑا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعدّد ازواج سے بعض اوقات گھروں میں پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور انہی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے مغربی قوموں نے فحاشی کو اختیار کیا ہے لیکن اسلام کے نزدیک ان پیچیدگیوں کے مقابلے میں فحاشی زیادہ قابلِ مذمّت اور بُری ہے اس لیے اُس نے تعدّدِ ازواج کی اجازت دی ہے۔

یہی حال ضبطِ تولید کا ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں معاشی استحکام کا بھی ایک مقام ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی مؤثر تدابیر بتائی ہیں لیکن اُس کے ہاں اقدار کی جو ترازو نصب ہے اس میں اخلاقی استحکام معاشی استحکام سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ اس لیے یہاں اصل اہمیت اخلاقی استحکام کو ہی حاصل ہوگی۔ کیونکہ اس میں بگاڑ پیدا ہونے سے اس کا سارا ڈھانچہ ہل کر رہ جاتا ہے۔

کسی نظامِ حیات میں اصل چیز وہ اقدار ہیں جو مختلف شعبوں اور مختلف افعال و اعمال کے درمیان تناسب قائم کر کے ان کی اہمیت متعین کرتی ہیں۔ ایک نظام جس میں زندگی کے سارے

(باقی صفحہ ۳ پر)

(بقیہ اشارات)

معاملات کو مادی نقطۂ نظر سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ وہاں حلال و حرام اور خوب و ناخوب کے اصل پیمانے مادی فوائد اور نقصانات ہونگے۔ اس کے مقابلے میں وہ نظام جو سب سے زیادہ زور اخلاقی قدروں کو دیتا ہے اس میں صحیح اور غلط کا فیصلہ انہی قدروں کے مطابق ہوگا اور انہی کی نسبت سے ساری چیزوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے گا۔

مسلم قوم کو آج جو پیچیدہ مسائل درپیش ہیں اور جن کی پیچیدگی ہر روز بڑھتی چلی جارہی ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس سادہ سی حقیقت کو ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے اور اس بنا پر بہک کر ہر راہرو کے ساتھ بے سمجھے بوجھے چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ـ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ	اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کریگا سو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکاموں اور نامرادوں میں سے ہوگا اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دیگا جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا حالانکہ وہ خود

(بقیہ مطبوعات)

۵۔ حضرات کے لیے قرآن کے پیغام اور دعوت کو سمجھنے اور کلام الٰہی سے مناسبت کرنے کے لیے بڑا مفید اور کارآمد ہے۔ پہلے حصہ میں ایمانیات، تزکیہ نفس اور عبادات کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ حسن اخلاق، حسن معاشرت، معاملات اور تبلیغ دین پر مشتمل ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و کتابت بڑا عمدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مرتب اور ناشر کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (آل عمران - ۸۶) اس بات پر شہادت دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی ہیں اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

یعنی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان کے دعوے کے باوجود ہمیں اُن پر یقین پیدا نہیں ہوتا اور ہم اُس کے دین کے علاوہ کچھ دوسرے افکار و نظریات اور کچھ دوسرے عقائد و تصورات میں اپنی فلاح کی راہ ڈھونڈتے ہیں۔

مسلم قوم اس وقت واقعی دنیا میں سب سے زیادہ پست اور پسماندہ ہے۔ یہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی کمزور ہے۔ اسے ہر طرف سے مختلف مصائب گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارا اسلام سے تعلق ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ کی بندگی، اُس کے رسول کی غلامی اور اُس کے دین کی اتباع کے دعوے کے باوجود کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں، کچھ دوسرے رہنماؤں کی غلامی کا طوق گلے میں پہن لیا ہے اور احکامِ الٰہی کو نظر انداز کر کے کچھ دوسرے اصول اپنانے کی کوشش کی ہے۔

اسلام کے ساتھ ہمیں زبان کی حد تک تعلق ضرور ہے لیکن اس کے اختیار کرنے کے بعد فکر و نگاہ کے جن زاویوں، عمل کے جن میدانوں اور خوب و ناخوب کے جن پیمانوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے اُس کے لیے ہم قطعاً تیار نہیں ہوتے۔ وہ قوم جو دعویٰ تو اللہ کی بندگی کا کرتی ہے لیکن وہ زندگی کے کسی شعبے میں اس بندگی کے بنیادی تقاضوں تک کو پورا کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ اس دین کی برکات سے کس طرح بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں جو یہ بار بار آتا ہے کہ جَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ راہِ حق پر چلنے میں خواہ تمہیں کتنی دقتیں پیش آئیں، اس میں کتنے ہی موانع حائل ہوں اور اس راہ پر خواہ تمہیں مال و جان کی کتنی ہی قربانی پیش کرنی پڑے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے ہٹنا نہ چاہیے۔ باطل نظامِ حیات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر خدا پرستانہ نظامِ زندگی کی تشکیل اور صحت مند تصورات کی نشو و نما کوئی بچوں کا کھیل

نہیں جسے محض خوشی کھیل لیا جائے۔ اس کے لیے اللہ اور اُس کے رسُول پر غیر متزلزل یقین اسلام کے صحیح اور برحق ہونے پر مکمل اعتماد اور اس کی دنیوی اور اخروی برکات اور واحد ذریعۂ نجات ہونے پر مکمل بھروسہ ضروری ہے پھر اس کے مطابق سب سے پہلے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کا عزم صمیم اور بالآخر پُوری دنیا پر اس کے غالب کرنے کا عزم اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں، انہیں برداشت کرنے کی ہمت اور جو قربانیاں دینی پڑیں اُن کے لیے رضامندی ایمان کے بنیادی تقاضے ہیں۔ جب تک ہم ان ساری منازل کو طے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہم کبھی بھی دنیا میں عزت و آبرو کا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا میں بے یقینی سے زیادہ کوئی بڑا گناہ نہیں اور نفاق سے زیادہ کوئی مہلک مرض نہیں۔ ان دونوں سے ہمیں نجات حاصل کرنی چاہیے۔

(بقیہ رسائل و مسائل) پہننا شروع کر دی تھیں لیکن آپؐ نے جب اسے اتار دیا تو صحابہ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں اُتار دیں۔ مُسند احمد میں ایسی متعدد روایات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے: اتخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من ذھب . . . فاتخذ الناس خواتیم الذھب فقال انی کنت البس ھذا الخاتم وانی لن البسہ ابداً فنبذہ فنبذ الناس خواتیمھم

جہاں تک لوہے کی انگوٹھی کا تعلق ہے، اس کے استعمال کا صریح جواز بعض دوسری احادیث سے بھی نکلتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم مبارک کے متعلق ابوداؤد، باب خاتم الحدید میں یہ الفاظ موجود ہیں: کان خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حدید ملوی علیہ فضۃ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی لوہے کی تھی جس پر چاندی چڑھائی گئی تھی)۔ یہ حدیث سنن نسائی میں بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر و لحاظ ہے کہ موجودہ زمانے میں فولاد STAINLESS STEEL جس سے بالعموم انگوٹھیاں بنائی جاتی ہیں یہ متعدد آمیزشوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے مجرد لوہے کی انگوٹھی کو اگر مکروہ قرار دیا بھی جائے تب بھی جو انگوٹھیاں سونے کے ماسوا لوہے اور دوسرے مرکبات سے تیار کی جاتی ہیں، ان کے استعمال کی ممانعت کسی مضبوط دلیل پر مبنی نظر نہیں آتی۔ (غ۔ ع)